ڈاکٹر شیخ محمد اکرام

علامہ شبلی نعمانیؒ

اور

مغربی علوم سے استفادہ

علامہ شبلی نے عمر کے آخری آٹھ نو سال میں بعض حالات کے تابع جن خیالات کا اظہار کیا اور ان کے جانشین سید سلیمان ندوی نے حیاتِ شبلی کے طویل دیباچہ میں استاد کے جن کارناموں پر زیادہ زور دیا اس سے یہ خیال عام ہو گیا ہے کہ مولانا شبلی کا اصل کام مستشرقین کا رد[1] اور مغربی خیالات کا مقابلہ کرنا تھا۔ یہ حقیقت بالعموم نظر سے اوجھل ہو گئی ہے کہ انھوں نے مدتوں مستشرقین کے مہیا کردہ علمی خزانوں اور مغرب کے علمی اصولوں سے استفادہ کیا اور یہی اخذ فیض تھا جس سے صرف قدیم روش کے علما ہی نہیں، بلکہ شبلی کے اپنے نام نہاد جانشینوں کے مقابلے میں ان کی سربلندی کا سامان ہوا اور نظری طور پہ بھی شبلی تمام عمر خذ ما صفا ودع ما کدر کی تلقین کرتے رہے۔

یہ غلط فہمی بہت عام ہے۔ اس سے نہ صرف شبلی کی اصل شخصیت نظر سے اوجھل ہو گئی ہے

---

[1] سید سلیمان مستشرقین مثلاً سپرنگر، میور وغیرہ کے نام گنا کر اور ان کے طریق کار کی وضاحت کر کے لکھتے ہیں: "ایسے ہوش مند حریفوں کے مقابلہ کے لیے ساری دنیائے اسلام میں سے جو شیر دل اسلام کی صف سے سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی ہی تھے۔" (ص ۲۴-۲۵) انھیں خیال نہیں رہا کہ شبلی کی عمر دس بارہ سال سے زیادہ نہ ہوگی جب سید احمد خاں نے میور کی کتاب کا رد لکھا۔ اس کا انگریزی ترجمہ انگلستان میں چھپوایا اور اس ضمن میں جو اخراجات پیش آئے انھیں پورا کرنے کے لیے اپنا کتب خانہ بلکہ برتن اور گھر کا سامان بیچنے پر آمادہ ہو گئے۔

سید امیر علی کی اسپرٹ آف اسلام کا نقشِ اوّل بھی مولانا شبلی کے اس میدان میں اترنے سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا۔

بلکہ قوم کی علمی ترقی کو بھی ضعف پہنچا ہے۔ اس لیے ضرورت ہے کہ شبلی کی علمی زندگی کے اس پہلو کو ذرا تفصیل سے بیان کر دیا جائے

غیر قوموں کے مفید علوم وفنون اور دوسری مفید باتوں کے اخذ کی ضرورت

علامہ شبلی نے اپنی کئی تحریروں میں اس امر پر رنج کا اظہار کیا ہے کہ عہدِ حاضر کے مسلمانوں نے "تعصب اور تنگ حوصلگی" سے کام لے کر باقی قوموں کے مفید علوم وفنون کا دروازہ اپنے لیے بند کر رکھا ہے۔ حالانکہ مسلمانوں نے اپنے عہد عروج میں کبھی یہ طریق کار اختیار نہیں کیا۔ ان کے ایک طویل مضمون کا عنوان ہے تراجم، اس کے شروع میں لکھتے ہیں:

"مسلمانوں کو آج کل غیر قوموں سے جو اجتناب ہے اور جس کی وجہ سے وہ دنیا کے تمام مفید علوم وفنون سے محروم ہیں۔ اس کے لحاظ سے حقیقت میں مشکل سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے کسی زمانہ میں غیر زبانوں سے کچھ فائدہ اٹھایا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے، اور اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ عہد وسطیٰ میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کر لیا تھا۔"[۲]

اس کے بعد بیروت کے ایک عیسائی مؤرخ کی تحریر نقل کر کے جس میں اس امر پر تعجب کا اظہار کیا تھا کہ اگرچہ مسلمانوں نے ابتدا میں علمی ذخیروں کو بُری طرح برباد کیا، اسکندریہ کا کتب خانہ تباہ کیا، اہرام مصر اور ابوالہول کو مٹانا چاہا لیکن بعض ضرورتوں کے زیر اثر خود غیر قوموں کے علوم وفنون کی طرف متوجہ ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

"حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کے موجودہ تعصب اور تنگ حوصلگی سے اس قسم کے قیاسات پیدا ہونا بعید نہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ مسلمان جب مسلمان تھے تو انھوں نے کبھی غیر قوموں سے کسی قسم کا تعصب نہیں ظاہر کیا۔ اوروں کا تو کیا ذکر ہے خود شارع علیہ السلام نے غیر قوموں کی بہت سی باتیں پسند فرمائیں اور اختیار کیں۔ جنگِ احزاب میں حضرت سلمان فارسی نے جب ایران کے طریقہ کے موافق خندق کھودنے اور طائف کے محاصرہ میں منجنیق کے استعمال کرنے کا مشورہ دیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بے تکلف منظور فرمایا اور اس پر عمل کیا۔ ملکی انتظامات میں بھی آپ نے غیر قوموں کے اصول وآئین پسند فرمائے۔

[۲] مقالات شبلی جلد ششم ص ۱

اور اختیار کیے - شاہ ولی اللہ صاحب (جن سے بڑھ کر محدث اور اسرار شریعت کا نکتہ شناس کون ہوگا) تحریر فرماتے ہیں کہ وکان قباد وابنہ نوشیروان وضعا علیھم الخراج والعشر فجاء نحو من ذلک - یعنی قباد اور اس کے بیٹے نوشیروان نے لوگوں پر خراج اور عشر لگایا تھا تو شریعت اسلامی نے بھی اس کے قریب قریب حکم دیا - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے چونکہ یہودیوں سے اکثر خط و کتابت رہتی تھی اس لیے آپ نے زید بن ثابتؓ کو حکم دیا اور انھوں نے عبرانی زبان بھی سیکھ لی - حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب فتوحات کو نہایت ترقی ہوئی تو ولید بن ہشام نے کہا کہ میں نے شام کے سلاطین کو دیکھا ہے کہ ان کے ہاں فوج اور خزانہ کا جدا گانہ دفتر مرتب رہتا ہے - چنانچہ حضرت عمرؓ نے اس اصول کے موافق فوج اور خزانہ کا دفتر قائم کیا - یہاں تک کہ نام بھی وہی عجمی یعنی دیوان رکھا جو بعینہٖ فارسی لفظ ہے - صحابہ میں سے بہتوں نے فارسی زبان سیکھ لی تھی - چنانچہ ہرمزان جو عجم کا ایک رئیس تھا جب حضرت عمرؓ کے دربار میں آیا تو مغیرہؓ نے فارسی میں اس سے سوال و جواب کیے۔

غرض یہ امر محتاجِ شہادت نہیں کہ قرنِ اول کے مسلمانوں نے جب موقع اور ضرورت ہوئی تو معاشرت اور تمدن کے متعلق بے تکلف غیر قوموں کے اصول اور آئین اختیار کیے ۔"

شبلی کا اپنا طریقِ کار

غیر قوموں سے علمی اخذ فیض کو شبلی جس قدر ضروری سمجھتے تھے اور اس راہ کی مشکلیں دور کرنے کے لیے انھوں نے جو کچھ کیا، اس کے اصولی اور نظری پہلوؤں کا ذکر ہو چکا - لیکن اس معاملے میں ان کے نقطۂ نظر کا اندازہ ان کے عملی طریق کار سے بھی ہو سکتا ہے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اپنے حالات کے تحت انھوں نے اس اخذ فیض کی پوری کوشش کی - جب وہ علی گڑھ پہنچے تو ان کی عمر پچیس سال کی تھی اور ان کی رسمی تعلیم ایک عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی - یہ تعلیم قدیم علوم اور عربی اور فارسی تک محدود تھی - انھوں نے انگریزی کبھی نہیں پڑھی تھی - علی گڑھ پہنچنے کے بعد شروع شروع میں انھوں نے کالج کے عام انگریزی خوان طلبا کی سطحیت اور علمی بے مائگی کا بڑے مؤثر انداز میں مضحکہ اڑایا - (جدید کالجوں کے عام طلبا کی نسبت جن کا منتہائے مقصود ملازمت کی خاطر ایک ڈگری حاصل کرنا ہوتا ہے ان کا یہ

نقطۂ نظر آخر تک رہا۔ اور ان کی اپنی علمی شیفتگی کا خیال کریں تو یہ تاثر بے جا نہ تھا) لیکن جب ان کی رسائی علم و فن کے ان (مشرقی) خزائن تک ہوئی جن کا قدیم مدرسوں میں نام بھی نہ آتا تھا، لیکن جنھیں مغرب کے اہلِ علم نے چھاپ کر شائع کر دیا تھا اور پھر آگے چل کر انھیں کچھ اندازہ ہوا کہ مختلف علوم مثلاً تاریخ میں علمائے مغرب نے کیا برگ و بار پیدا کیے ہیں تو انھوں نے اپنے حالات کے مطابق اور اپنے دائرۂ عمل (تاریخ۔اسلامیات) کے اندر اہلِ مغرب کی علمی کوششوں کے نتائج اور ان کے فنی اصولوں سے باخبر ہونے کی پوری کوشش کی اور ان کوششوں اور اصولوں بلکہ فلاسفۂ مغرب کے اہم نظریات سے (جس حد تک وہ ان سے واقفیت حاصل کر سکے) اپنی قوم کے اہلِ علم کو روشناس کرتے رہے۔

علومِ مغرب سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے ایک مغربی زبان جاننا ضروری تھا۔ شبلی کو جب مغرب کے علمی خزائن کا اندازہ ہوا اس وقت نئی زبانیں سیکھنے کا وقت بہت حد تک گذر چکا تھا۔ اب انھوں نے یہ کیا کہ ایک تو علما کی شدید اور مسلسل مخالفت کے باوجود ندوۃ العلما کے دارالعلوم میں انگریزی کو بطور ایک لازمی مضمون کے شامل نصاب کیا، تاکہ کم از کم آنے والوں میں یہ کمی نہ رہے اور جہاں تک اپنے بس میں تھا، اس عمر میں بھی کوشش کی کہ مغربی زبانوں سے تھوڑی بہت واقفیت ہو جائے۔ مولانا ضیاء الحسن علوی جو ان کے مخصوص تلامذہ میں سے تھے، علامہ کی نسبت لکھتے ہیں: "انگریزی کے حرف شناس تھے۔ کبھی کبھی الفاظ پوچھ کر صحیح جملے ادا کرتے۔ فرانسیسی ڈاکٹر آرنلڈ سے سیکھی تھی اور اس کا اپنے مضمون اور موضوع کے مطابق کچھ مطلب حل کر لیتے تھے۔"[۳] مولانا نے اپنی فرانسیسی سے واقفیت کی نسبت ۱۸۹۲ء کے ایک مضمون (کتب خانہ سکندریہ) میں لکھا تھا۔ "فرنچ تصنیفات کے متعلق مجھ کو مجبوراً کہنا پڑتا ہے کہ میں نے ٹوٹی پھوٹی فرنچ سیکھ لی ہے اور اس لیے اس سے متمتع ہونا میرے لیے چنداں دشوار نہ تھا۔"[۴] بعد کی ایک عبارت سے جو الندوہ کے دوسرے پرچے میں درج ہے۔ خیال ہوتا ہے کہ یا تو "ٹوٹی پھوٹی فرنچ" لکھتے وقت انھوں نے انکسار سے کام لیا ہے یا اس عبارت کی تحریر کے وقت ان کی فرنچ دانی نے کافی ترقی کر لی تھی۔ وہ دو فرانسیسی مصنفین کا نام لے کر لکھتے ہیں۔ "سیدیو اور مونک کی تصنیفات ہم نے اچھی طرح دیکھی اور پڑھی ہیں۔"[۵] علامہ شبلی نے فرانسیسی سیکھ لی تھی اور انگریزی کے بھی حرف شناس تھے۔ اور معمولی عبارت

---

۳ یادِ ایام (ضیاء الحسن علوی) صـ۷ ۴ مقالاتِ شبلی جلد ششم ص۱۱۹، ۵ مقالاتِ شبلی جلد ہفتم ص۱

سمجھ لیتے تھے۔ لیکن ظاہر ہے کہ وسیع اخذ فیض کے لیے یہ واقفیت کافی نہ تھی۔ لیکن اگر طلب صادق ہو تو راستہ نکل ہی آتا ہے۔ ایک تو انھوں نے زمانہ وہ پایا تھا جب غدر کی تباہی کے بعد یہ احساس نسبتاً عام ہو گیا تھا کہ پرانی لکیریں پیٹنے کا وقت گیا۔ اب اگر مسلمانوں کو عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنا ہے تو انھیں نئے طریقے سیکھنے ہوں گے اور اپنے خیالات اور علم و ادب میں وسعت اختیار کرنی پڑے گی۔ جن فرض شناس اور قابل عزت ہستیوں کو اس کا احساس زیادہ شدید تھا اور جنھیں ٹوٹی کشتیوں سے ایک بیڑہ تیار کرنا تھا۔ انھیں خود نئے طور طریقوں سے پوری واقفیت نہ تھی اور جدید علم و فن کے جن سرچشموں سے وہ علم و ادب کی کھیتی کو پانی دلانا چاہتے تھے، وہاں تک ان کی اپنی رسائی نہ تھی۔ لیکن ان باہمت ہستیوں نے ناخنوں سے کوئیں کھود دے، جدید کے اصل سرچشموں تک ان کی پہنچ نہ سہی، لیکن ان سے جو نہریں نکلی تھیں ان سے پانی لے کر کشتِ علم و ادب کو سیراب کیا۔ کھیتی کی۔ محنت اور ہمت اور سمجھ سے قلبہ رانی کی اور بالآخر ایسی فیض رسانی کا سامان کیا جو بعد میں ان لوگوں سے نہ بن آئی جو ان سرچشموں سے پوری طرح باخبر تھے بلکہ ان کا پانی پی پی کر جوان ہوئے تھے علی گڑھ تو خیر ان تعمیری کوششوں کا مرکز تھا لیکن اطرافِ ملک میں بھی فرض شناس اور طبعی جوہر سے مالا مال ہستیوں نے تھوڑی پونجی سے قوم کے لیے جو سرمایہ بہم پہنچا دیا اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں حالی اور آزاد کو مغربی ادب سے کتنی واقفیت تھی لیکن کیا انھوں نے محدود واقفیت اور مستعار معلومات کے چند بیجوں سے ایک نئی فصل کھڑی نہیں کر دی، جو آج بھی لہلہا رہی ہے لیکن ان کی کوششوں کا میدان ادب تھا۔ جس میں جوہرِ طبعی اور شادابیِ تخیل سے بڑی حد تک کام چل جاتا ہے شبلی نے چمنِ علم کی باغبانی کی۔ پہلے تو باغ کی توسیع کی۔ نئی نئی کیاریاں لگائیں۔ پھر کہیں سے بیج، کہیں سے کھاد لے کر انھیں خونِ جگر سے سینچا۔ انھیں حالی اور آزاد کی نسبت مغرب کی علمی کوششوں سے باخبر ہونے کی زیادہ ضرورت تھی۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے فرنچ سیکھی اور انگریزی میں شُدبُد پیدا کی لیکن چونکہ یہ کافی نہ تھا۔ اس لیے وہ اپنی کمی مختلف طریقوں سے پوری کرتے رہے۔ ایک طریق کار تو اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے مدد لینے کا تھا۔ جس کی قیام کالج کے دوران میں بڑی آسانیاں تھیں۔ ان کے لیے اپنے رفقائے کار میں کئی ایسی ہستیاں تھیں جن کی کتابوں

---

۵ حیاتِ شبلی ص ۱۴۴

اور معلومات سے انھیں ساز و سامان میسر آتا تھا۔ سرسید اور آرنلڈ کے احسانات اس معاملے میں سب سے زیادہ تھے۔ لیکن ان کے علاوہ بھی کالج کی اسٹاف میں کئی اہلِ علم موجود تھے جن سے شبلی کو مدد ملتی ہوگی۔ حیدرآباد دکن میں ان کے بڑے علمی محسن سید علی بلگرامی تھے۔ جن کے ہاں ہر ہفتے ولایت سے علومِ شرقی کے متعلق تازہ مطبوعات آتی تھیں جو سب شبلی کی نظر سے گذرتیں اور جن میں سے بعض تو ان کی نذر ہو جاتیں (اور اب ندوہ کے کتب خانہ میں موجود ہیں۔ ندوہ پہنچنے کے بعد علمی حصولِ فیض کا یہ کام مشکل ہو گیا۔ اب انھوں نے اپنے عزیزوں کو اس معاملے میں زحمت دینی شروع کی۔ انھوں نے اپنے ماموں زاد بھائی مولوی حمید الدین بی۔ اے سے جس طرح یورپ کے حکما و فلسفہ کے متعلق معلومات حاصل کرنی چاہئیں، اس کا حوالہ ہم آیندہ صفحات میں دیں گے۔ سیرت النبیؐ کے شروع کرنے کے بعد جب انھیں مغربی مصنفین کے بیانات سے بالتفصیل واقفیت کی ضرورت پڑی تو انھوں نے اپنے دفتر میں ایک گریجوایٹ کے لیے مستقل جگہ رکھی۔ اور کچھ عرصہ بعد مسٹر (مولٰنا) عبدالماجد دریابادی کو اس اسامی پر متعین کیا۔ لیکن اس سے پہلے وہ احباب و تلامذہ سے مدد لیتے رہتے تھے۔

جولائی ۱۹۱۳ کے ایک خط میں بمبئی سے لکھتے ہیں: "یہاں بعض احباب اور تلامذہ ہیں جو انگریزی معلومات میں مدد دیتے ہیں۔ مثلاً پروفیسر عباس اور مولوی محمد علی بی۔ اے اور شیخ عبدالقادر ایم۔ اے"۔

مغرب کی علمی کارکردگی سے باخبر رہنے کا تیسرا ذریعہ قاہرہ اور بیروت کے عربی رسالے اور اخبارات تھے۔ مولانا کی بڑی خواہش تھی کہ مستشرقین کی جو (پنجسالہ) کانفرنس ہوتی ہے اس میں شرکت کریں۔ ۱۸۹۹ میں کانفرنس کا اجلاس اٹلی میں تھا۔ مولانا کا ارادہ تھا کہ اس میں شرکت کریں۔ ("میں بھی انشاء اللہ جاؤں گا")[۵۷] لیکن وہ ایک طویل علالت سے ابھی ابھی صحت یاب ہوئے تھے۔ ضعف کی وجہ سے چاہتے تھے کہ کوئی شریکِ سفر ساتھ ہو۔ پہلے نواب حبیب الرحمٰن شروانی اور پھر نواب سید علی حسن خان کو بڑے زوردار خط لکھے لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے۔ "مولانا دوبارہ بیمار پڑ گئے اور وقت نکل گیا"[۵۸] اور دوسرے فائدوں کے علاوہ یورپ کے اہلِ علم سے ملنے کا جو موقع تھا وہ ہاتھ سے جاتا رہا۔ لیکن مولانا مصر اور شام کا تو اسی لیے پہلے سفر کر چکے تھے۔ وہاں کے ممتاز اہلِ علم سے ذاتی

---

۵۷ مکاتیبِ شبلی جلد دوم ص۱۶۷ ۵۸ حیاتِ شبلی ص۳۴۱

تعارف تھا اور وہاں کے علمی جرائد و مطبوعات سے پوری طرح باخبر تھے۔ مصر کے مغرب سے علمی تعلقات حملہ نپولین کے وقت سے (۱۸۰۰ء کے قریب) شروع ہو چکے تھے اور صرف انگریزی ہی تک محدود نہ تھے۔ شام میں بھی حال تھا۔ بلکہ بیروت کی امریکن یونیورسٹی اور لبنان کے عیسائیوں کی وجہ سے مغربی علوم کے عربی میں منتقل ہونے کا خاص اہتمام تھا۔ مولانا مصر اور شام کے عربی رسالے اور کتابیں منگاتے تھے۔ نواب حبیب الرحمٰن شروانی کو فرید وجدی کے رسالہ "الاسلام فی عصر العلم" کی نسبت لکھتے ہیں:

"مصر میں ایک پرچہ اسلام کے ثبوت اور فلسفۂ حال کی تطبیق پر نکلا ہے اور ماہوار نکلتا ہے۔ زور کا پرچہ ہے اور واقعی عمدہ ہے۔ ایڈیٹر فرنچ اور جرمن کا ماہر ہے۔ میں نے منگوایا ہے اور مسلسل آرہا ہے۔"

یہ خط ۱۹۰۲ کا ہے۔ اس سے پہلے ۱۸۹۹ کے ایک خط میں مولوی محمد ریاض حسن خاں کو ان عربی اخبارات کے نام لکھے ہیں جو مولانا کے پاس آتے تھے۔ ثمرات الفنون (استنبول) السلام (طرابلس) المنار۔ الہلال۔ اسی خط میں مصر کے رسالے المقتطف اور اخبار المؤید کا ذکر بھی ہے مصر و شام کے رسائل میں مشرقی اور اسلامی مباحث پر مغربی اہل علم کے خیالات نقل ہوتے تھے اور مولانا کی ان خیالات سے واقفیت کا تیسرا ذریعہ تھے۔ مثلاً الندوہ کے ایک مضمون کا عنوان ہے۔ ڈاکٹر برٹن اور تاریخ فلسفۂ اسلام۔ ڈاکٹر برٹن ایک جرمن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں اور اسلامی فلسفہ کی تعلیم کے پروفیسر تھے۔

مولانا لکھتے ہیں: "یورپ میں سیکڑوں فضلا ہیں۔ جو اسلامی علوم کی تحقیقات میں مصروف ہیں لیکن ڈاکٹر برٹن کا کمال اس قدر مسلّم ہو گیا ہے کہ اس خاص مضمون کے متعلق وہ مرجع عام بن گیا ہے۔" ڈاکٹر برٹن کی تصانیف جرمن زبان میں تھیں۔ لیکن ان کے متعلق المؤید میں ایک تفصیلی آرٹیکل تھا جس سے اخذ کر کے مولانا نے مذکورہ بالا مضمون لکھا۔

خذ ما صفا و دع ما کدر

سید سلیمان ندوی مولانا شبلی کی نسبت لکھتے ہیں:

"علی گڑھ کی مرکزیت کے سبب سے یورپ میں اسلام پر جو کتابیں لکھی جاتی تھیں، وہ فوراً وہاں پہنچ جاتی تھیں۔ مولانا ان کے مضامین سے واقفیت پیدا کرتے تھے اور قابل اعتراض

باتوں کا جواب دیتے تھے"۔

مصنف حیاتِ شبلی کا یہ بیان ان کے اس بنیادی نظریے کا ایک پرتو ہے کہ علامہ شبلی کا اصل کام بلکہ اصل زندگی مستشرقینِ یورپ کے اعتراضات کا رد اور ان کی غلط فہمیوں کا ازالہ تھا۔ بلاشبہ اس معاملے میں مولانا شبلی ہمارے سب سے بڑے محسن ہیں۔ لیکن یورپ کی تصانیف کی نسبت مولانا کا نقطۂ نظر محض منفیانہ اور معترضانہ نہ تھا۔ 'خذ ما صفا ودع ما کدر' کا تھا۔ انھوں نے مستشرقین یورپ کے غلط اعتراضات کی تردید کی۔ ان کے مقالات میں مقامی اہل قلم کی قابلِ اعتراض باتوں کی تردید کی بھی کئی مثالیں مل جائیں گی۔ لیکن چونکہ مغربی اہل قلم کے اعتراضات بڑی کثرت سے تھے، اور انگریز حکمرانوں کے علاوہ انگریزی خوان طبقہ بھی ان اعتراضات سے متاثر ہوتا تھا، اس لیے ان اعتراضات کے جواب بھی زیادہ ہیں اور جس مدافعانہ جدوجہد کو سرسید نے سر ولیم میور کی کتاب کی تردید سے شروع کیا تھا، اسے مولانا نے اپنے علم و فضل اور سلیقہ تحریر سے بڑی ترقی دی لیکن مغربی کتابوں کے مطالعہ سے ان کا مقصد فقط "قابلِ اعتراض باتوں کا جواب" نہ تھا۔ بلکہ اچھی باتوں کا اخذ کرنا بھی تھا۔ اور فی الحقیقت مغرب کی علمی ترقیوں سے یہی استفادہ تھا جو شبلی کو اپنے جانشینوں سے ممتاز کرتا ہے۔ اس اخذ فیض کی سب سے نمایاں مثال تو تاریخ کے دائرہ میں نظر آتی ہے جو مولانا کی علمی جولانیوں کا اصل میدان تھا اور جسے ہم ایک علیحدہ مضمون میں بیان کریں گے۔ لیکن اس کے علاوہ علامہ دوسرے علوم میں بھی مغربی خیالات کا پتہ لگاتے رہے۔ ان سے اپنی تصانیف کی رونق بڑھاتے اور ان خیالات کو قوم میں عام کرنے کی کوشش کرتے رہے۔

عقائد و کلام کے معاملہ میں بھی وہ جس طرح حکمائے یورپ کی دلائل سے مدد لینا چاہتے تھے اور یورپ کے نظامِ فکر سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے وہ جس طرح بے تاب تھے اس کا اندازہ ان شکایتوں سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے ماموں زاد بھائی مسٹر حمید الدین بی اے کی اس سلسلے میں کیں۔ انہی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

"علوم کلام کی تاریخ لکھ رہا ہوں۔ وہ بھی قریب الختم ہے۔ اب کلام جدید کا مرحلہ ہے۔ کوئی انگریزی دان دوست ہوتا تو بڑا کام نکلتا۔ جو حکمائے یورپ روح و واجب الوجود

کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل سے کتاب کی بہت رونق ہوتی۔ تم سے زیادہ کون اس مصرف کا تھا۔ انگریزی دان تھے۔ عربی دان تھے۔ عزیز تھے۔ لیکن ان سب کچھ ہونے کے ساتھ بھی کچھ نہیں۔ بہتیرا کہا کہ یورپ کے فلسفہ کا ہلکا سا ڈھانچہ کھڑا کر دو تو بہت بصیرت ہو۔ تم کو کس کی پروا ہے۔ حالانکہ جو حصہ اب لکھ رہا ہوں اس میں مدد دینا ایک مذہبی اور قومی کام ہے۔"

مولانا شبلی کے مقالات کا بغور مطالعہ کریں تو صاف نظر آتا ہے کہ نہ صرف وہ حکمائے مغرب کی دلائل سے عقائد اسلامی کو تقویت دینا چاہتے تھے اور اپنی بصیرت کے لیے مغربی نظام فکر سے آگہی حاصل کرتے تھے بلکہ انھوں نے اس امر کی باقاعدہ کوشش کی کہ مسلمان سائنس کے بنیادی نظریے قبول کرلیں اور فلسفہ مغرب سے ان کا بعد و اجتناب دُور ہو۔ مقالات شبلی کی ساتویں جلد فلسفیانہ مباحث کے متعلق ہے۔ اس میں پہلے چار مقالات کا عنوان ہے۔ فلسفۂ یونان اور اسلام۔ ان میں ایک عمومی مضمون کے بعد تین مقالات میں ان اضافوں اور ترمیموں کی تفصیل دی ہے جو مسلمانوں نے فلسفۂ یونان میں کیں۔ پانچویں مقالے کا عنوان ہے۔ فلسفۂ اسلام اور فلسفۂ قدیم و جدید۔ اس کے بعد تین مقالات جدید فلسفہ و علوم کے اہم مسائل کے متعلق ہیں۔ پانچواں مقالہ غالباً سب سے پہلے لکھا گیا۔ کیونکہ اسے مقالات شبلی کے قدیمی مجموعہ سے نقل کیا گیا ہے اور باقی سات بہت بعد۔ الندوہ میں شائع ہوئے لیکن فلسفیانہ مقالات کے مرتب نے غالباً اسے درمیان میں اس لیے جگہ دی کہ یہ مضمون قدیم اور جدید فلسفہ کے بیان میں بیچ کی کڑی ہے۔ اس میں مولانا کا بنیادی نظریہ بیان ہوا ہے۔ (جس کے علامہ اقبال بھی قائل تھے) کہ فلسفۂ قدیم و جدید کے درمیان فلسفۂ اسلام بیچ کا زینہ ہے۔ مولانا بالکل ابتدا میں تشریح کرتے ہیں "یہ مضمون درحقیقت تین مضمونوں پر مشتمل ہے۔ یعنی یونان کا فلسفہ کیا تھا؟ فلسفۂ حال کیا ہے؟ مسلمانوں کے فلسفہ کو ان دونوں فلسفوں سے کیا نسبت ہے؟" پھر یہ بتایا کہ خالص علمی حیثیت سے اہم ہونے کے علاوہ مولانا کا اس مضمون لکھنے سے مقصد یہ بھی ہے کہ غلط فہمیوں کی بنا پر "ہمارے علما کو فلسفۂ حال سے جو علیحدگی یا نفرت ہے" وہ حقیقتِ حال جاننے سے دُور ہو جائے۔ آگے چل کر کہتے ہیں:

"اس مضمون سے ظاہر ہوگا کہ مسلمانوں نے فلسفۂ قدیم کو فلسفۂ حال سے قریب کر دیا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ فلسفۂ یونان اور فلسفۂ حال میں بعد المشرقین کی نسبت ہے۔ اصول ارتقا کے

موافق کوئی شے دفعتہً ترقی نہیں کرسکتی۔ اس لیے فلسفۂ یونان کو فلسفہ حال تک پہنچنے کے لیے ایک درمیانی زینہ کا ہونا ضرور ہے اور یہ زینہ درحقیقت اسلام ہی کا فلسفہ تھا۔[9]

اس کے بعد انھوں نے اٹھارہ ایسے فلسفیانہ مسائل ترتیب دیئے ہیں جن میں حکمائے یونان یعنی "ارسطو و پیروانِ ارسطو" کی رائے کچھ تھی۔ "متکلمین اسلام" کی رائے اس کے مخالف۔ ان مخالف راوٗں کو ایک نقشہ کی صورت میں انھوں نے ایک دوسرے کے بالمقابل درج کرکے فلسفۂ قدیم سے مسلمان متکلمین کے انحراف کو بڑی خوبی سے واضح کیا ہے اور پھر ان میں سے اہم مسائل پر تفصیلی گفتگو کی ہے مثلاً جسم کی حقیقت پر ارسطو کے خیالات اور متکلمین کے بیانات (جنھیں انھوں نے شرح مواقف اور مثنوی مولانا روم کے طویل اقتباسات سے واضح کیا ہے) درج کرکے بڑی جلی قلم سے لکھتے ہیں:

"یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ یورپ کی موجودہ تحقیقات متکلمین کی رائے کے مطابق ہے۔"[10]

اسی طرح عناصر اربعہ کا مسئلہ ہے جس کے متعلق انھوں نے ۱۹۰۲ کے جلسہ ندوۃ العلما میں کہا تھا۔

از عناصر سہ و شصت آمدہ اینک بشمار
تو ہماں در گرد آتش و آب استی و باد

اور اپنے استاد مولانا محمد فاروق چریاکوٹی کی برہمی کا باعث ہوئے تھے۔ اس مسئلے پر بھی قدمائے یونان کی تحقیقات کا خلاصہ دے کر لکھتے ہیں:

"حکمائے اسلام نے سب سے پہلے اس بات سے انکار کیا کہ عناصر چار سے زیادہ نہیں ہو سکتے۔ شرح مواقف و شرح تجرید میں اس کو مفصلاً لکھا ہے اور شرحِ تجرید میں امام رازی کی پوری عبارت اس کے متعلق نقل کی ہے۔"[11]

لیکن انھوں نے ازراہِ انصاف اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ فلاسفہ یونان سے حکمائے اسلام کا انحراف محض قیاس پر مبنی تھا۔ انھوں نے تجربہ یا مشاہدہ کی بنا پر کوئی نیا عنصر دریافت نہیں کیا۔ لکھتے ہیں:

[9] مقالاتِ شبلی جلد ہفتم ص۳۰ [10] مقالاتِ شبلی جلد ہفتم ص۳۵۔ [11] ایضاً ص۳۹

"لیکن یہ اعتراض صرف احتمال آفرینی کی بنا پر تھا۔ کوئی نیا عنصر انھوں نے نہیں نکالا۔ نہ اس کی تحقیقات کی طرف توجہ کی۔"[۱۲]

اس کے بعد انھوں نے اس مسئلہ کے ان جزوی پہلوؤں کو بیان کیا جن پر حکمائے اسلام کی رائے فلاسفہ یونان سے مختلف تھی۔ مثلاً پانی کو یونانی جو سب سے زیادہ بارد مانتے ہیں۔ ابوالبرکات بغدادی نے اپنی کتاب المعتبر میں اس کا انکار کیا۔[۱۳] چنانچہ امام رازی کی شرح اشارات سے ایک طویل اقتباس دے کر صاحب المعتبر کے نقطۂ نظر کو واضح کیا ہے۔ اسی طرح "یونانیوں نے ہوا کو جو سب سے زیادہ لطیف مانا تھا۔ امام رازی نے شرح اشارات میں اس کو باطل کر دیا۔"[۱۴] اس سلسلے میں بھی امام رازی کی ایک طویل عبارت نقل کی گئی ہے۔

آگے چل کر زیادہ تفصیل سے ان امور کا ذکر ہے جن میں مسلمان مفکرین نے حکمائے یونان سے اختلاف کیا۔ مثلاً "شیخ الاشراق نے اس بات سے انکار کیا کہ آگ بھی کوئی عنصر ہے اور یہ امر بالکل تحقیقاتِ حال کے موافق ہے۔ یورپ کے تمام علمائے حال اس بات پر متفق ہیں کہ آگ عنصر نہیں۔"[۱۵] یا استحالہ کا مسئلہ ہے۔ "یونانی جو عناصر کے استحالہ کے قائل ہیں۔ یعنی یہ کہ ایک یہ کہ ایک عنصر بدل کر دوسرا عنصر ہو جاتا ہے۔ ابوالبرکات بغدادی نے اس سے انکار کیا۔" اس مسئلہ کی وضاحت کر کے اور شرح تجرید قوشجی سے ابوالبرکات کے خیالات نقل کر کے لکھا ہے۔ "ابوالبرکات کی یہ رائے بالکل آج کل کی طبیعات سے موافق ہے۔"[۱۶]

آخری تین مضامین علوم جدیدہ کے متعلق ہیں۔ ان کا مقصد علما کو فلسفۂ جدید اور سائنس کے اہم مسائل سے روشناس کرنا اور ان سے علما کی بھڑک دور کرنا ہے۔ پہلا مضمون دقیق فلسفیانہ قسم کا ہے۔ اس کا عنوان ہے علم کی حقیقت۔ اس میں علم کی ماہیت کے متعلق جدید حکمائے مغرب کے خیالات کی تشریح کی ہے۔ ان کا فلاسفہ یونان کے نظریوں سے موازنہ کیا ہے اور جدید حکما کی تائید کی ہے۔ اگلے مضامین، جدید سائنس کے دو اہم ترین مسائل کے متعلق ہیں۔ ایک کا عنوان ہے۔ جذب و کشش اس میں نیوٹن کے مشہور نظریۂ کشش (GRAVITY) کی تشریح ہے۔ بتایا ہے کہ حقیقت میں اس

---

[۱۲] مقالاتِ شبلی جلد ہفتم ص ۳۹، [۱۳] ایضاً ص ۳۹، [۱۴] ایضاً ص ۴۰ [۱۵] ایضاً ص ۴۰، [۱۶] ایضاً ص ۴۲
(۱۷ حاشیہ صفحہ ۱۳ ملاحظہ ہو)

سئلہ کی خفیف سی صورت یونانیوں میں بھی موجود تھی۔ "حکمائے اسلام نے اس کو بہت وسعت دی"۔ چنانچہ
س سلسلہ میں امام رازی کی کتاب مباحث مشرقیہ سے ثابت بن قرہ کے خیالات کو تفصیل سے نقل کیا
ہے اور لکھا ہے: "اس سے ترقی کر کے علما اس بات کے قائل ہوئے کہ تمام اجسام میں جذب اور کشش
ی خاصیت ہے یہاں تک کہ یہ خیال شعرا میں بھی پھیل گیا۔ اس ضمن میں مثنوی مولانا روم کا ذکر کیا ہے
بس کے متعلقہ اشعار سوانح مولانا روم میں نقل ہوئے۔ پھر وحشی یزدی کی مثنوی شیریں فرہاد کے کئی اشعار
پنے بیان کی تائید میں نقل کیے ہیں۔

آخری مضمون میں ڈاروِن کے مسئلہ ارتقا (EVOLUTION) کا بیان ہے۔ عنوان ہے
لسفۂ اسلام، مسئلہ ارتقا اور ڈاروِن۔ مسئلہ ارتقا کی ہمارے اہل قلم جس طرح ہنسی اڑاتے ہیں۔ اس
ا ایک موثر نمونہ اکبر الٰہ آبادی کی ابیات میں ہے:

کہا منصور نے خدا ہوں میں ڈاروِن بولے بوزنہ ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست فکرِ ہر کس بقدرِ ہمت اوست

معلوم ہوتا ہے شبلی کو ایک اہم علمی و فکری مسئلہ کا اس طرح مضحکہ اڑانا ناپسند تھا۔ وہ مضمون کے
نکل شروع میں لکھتے ہیں:

"ڈاروِن کی ۲۰ برس کی پیہم کوشش اور غور و فکر کی محنت کی داد ہمارے ملک نے تو یہ دی ہے
کہ "وہ انسان کو بندر سمجھتا ہے۔ اس لیے خود بندر ہے۔" لیکن ایک ایسا مسئلہ جس کو یورپ
کے تمام حکما تسلیم کرتے جاتے ہیں، اس قابل نہیں کہ اس کو ہنسی میں اڑا دیا جائے اس لیے
ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے یہ بتائیں کہ اس مسئلہ کی حقیقت کیا ہے۔ ڈاروِن کا کیا دعوےٰ ہے؟
اور اس کے اصول کیا ہیں پھر یہ دیکھیں کہ حکمائے اسلام کا اس کے متعلق کیا خیال تھا؟"[۴۹]

(حاشیہ صفحہ ۱۲) ہمارے اہل قلم "فلسفہ" کے لفظ کو جو غیر معمولی (بلکہ غیر صحیح) وسعت دے دیتے ہیں اور
س میں تمام عقلی علوم، بلکہ مختلف سائنسیں جن کی بنا قیاس عقلی پر نہیں، بلکہ تجربہ اور مشاہدہ پر ہے، شامل کر لیتے
یں، اس کی مثال اس مضمون میں بھی ملتی ہے۔ نیوٹن جدید سائنس کے بانیوں میں سے تھا لیکن مولانا لکھتے ہیں:
"سر آیزک نیوٹن یورپ کا مشہور فلاسفر ہے۔"

[۴۹] مقالات شبلی جلد ہفتم ص ۱۵۹

یہ سیر حاصل مضمون کوئی بائیس صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ پہلے سات آٹھ صفحوں میں مسئلہ کا علمی تجزیہ ہے۔ باقی صفحات میں رسائل اخوان الصفا، علامہ ابن مسکویہ۔ احمد نظامی سمرقندی کے وہ طویل اقتباسات درج ہیں جو نظریۂ ارتقا کے موافق ہیں۔

مولانا کے جن آٹھ فلسفیانہ مضامین کا ہم نے تجزیہ کیا ہے (اور جو فلسفیانہ مقالات والی جلد کی جان ہیں) ان کے بغور مطالعہ کرنے سے ایک تو یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ آٹھ مضامین فلسفہ کے متعلق متفرق مقالات نہیں بلکہ ایک مربوط سلسلہ مضامین ہے جسے غالباً ایک مستقل کتاب کی صورت میں شائع کرنے کا ارادہ تھا۔ دوسرے یہ امر بھی بدیہی ہے کہ اس سلسلہ مضامین کا مقصد یورپ کے فلسفہ جدیدہ پر اعتراض کرنا نہ تھا بلکہ مسلمان مفکرین کے خیالات اور فلسفہ جدید میں ربط دکھانا، بلکہ پیدا کرنا تھا۔

مولانا شبلی کی یہ علمی کوشش اس لیے بھی دلچسپ ہے کہ اس سلسلہ کے اکثر مضامین اس زمانے میں لکھے گئے جب مولانا ندوۃ العلما سے منسلک ہو گئے تھے اور ان میں بیشتر پہلے پہل الندوہ میں شائع ہوتے۔ ان میں سے ایک آدھ (مثلاً ارتقا والے مضمون) کی بعض حلقوں میں مخالفت بھی ہوئی (لیکن مولانا نے پرواہ نہیں کی بلکہ جب سید سلیمان نے ان اعتراضات کے پیش نظر قرآن مجید اور مسئلہ ارتقا کے عنوان سے ایک مضمون الندوہ میں شائع کیا تو مولانا نے "ناراضی" کا اظہار کیا "کہ اس سے کم ظرفوں کا حوصلہ بڑھتا ہے"۔ نیوٹن کے فلسفۂ کشش والا مضمون اس کے بعد لکھا گیا۔ لیکن افسوس کہ مولانا کی دوسری مصروفیتوں نے انھیں یہ موقع نہ دیا کہ وہ اس سلسلہ مضامین کو مکمل کر سکیں اور ان کے بعد اس کام کو تکمیل تک پہنچانا ایک طرف، ان کے جانشینوں نے ان کا انداز فکر ہی ترک کر دیا۔